© rasailojaraid.com

ظاہری اور باطنی۔ سو باطنی وجود کو ذاتِ خداوندی سے کچھ اس قسم کی نسبت ہے جیسے شعاعوں کو آفتاب سے، اور وجودِ ظاہری کو بمنزلہ دھوپوں کے جو شعاعوں سے پیدا ہوتی ہیں اور ہر صحن اور ہر میدان میں جُدا جُدا نظر آتی ہیں۔ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جیسے دھوپ کبھی آتی ہے کبھی چلی جاتی ہے ایسے وجودِ ظاہری کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا اور جیسے آفتاب کے طفیل سے شعاعیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں، ایسے ہی خداوند کریم کے طفیل سے اس وجود باطنی کو بھی ہمیشہ قیام ہے۔ اب سُنیئے! کہ جیسے آفتاب کے نور سے اوّل شعاعیں پیدا ہوتیں اور بعد میں دھوپیں ظاہر ہوتیں اور اس ترتیب ہی کے سبب سے جس قدر ہر قسم کے کمال آفتاب کے کمالوں میں سے یعنی نور، گرمی وغیرہ شعاعوں کو ملے وہ دھوپوں کو نہیں ملے۔ کتنی ہی بڑی اور خوش قطع دھوپ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح وجود باطنی اوّل ہے اور وجودِ ظاہری بعد میں۔ بلکہ وجودِ ظاہری کو وجودِ باطنی ہی کا پَرتو سمجھنا چاہیئے۔ جیسے دھوپ شعاعوں کا پَرتو ہے۔ سو لازم ہے کہ وجودِ باطنی کو اوّل فیض ربّانی پہنچے۔ بعد میں وجودِ ظاہری تک جاتے۔ سو یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے تمہارے وجودِ ظاہری تک حیات کا فیض پہنچ جاتے اور اوروں کے وجودِ باطنی کو بھی خبر نہ ہو۔ کیونکہ وجود باطنی کسی کا ہو، ہر کسی کے وجودِ ظاہری سے مقدم ہے۔ جیسے شعاعیں کسی طرف کیوں نہ ہوں، ہر جگہ کی دھوپ سے اشرف اور مقدم ہیں . . . . . "

موجودات کی "ذات" اور اُن کے "وجود" کا صدور آخر میں اُسی ایک وجود سے ہوتا ہے جس کا ایک مرتبہ ذاتِ بحت کا ہے۔ دوسرا عقل کا اور تیسرا شخص اکبر کا۔ اس وجود میں یہ سب کمال ہیں۔" . . . . ذاتِ خداوندی میں ایک ہو کر پھر سب کمال بھرے ہوتے ہیں یعنی وہ ایک ہے۔ سب کمالوں کے کام کرتا ہے۔ جیسے ایک شخص کلکٹری اور مجسٹریٹی کے دونوں کام کرتا ہے۔ کام کے سبب دو نام ہو گئے ہیں ورنہ ہے وہ ایک ہی۔ ایسے ہی ذاتِ خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع، بصیر کہلاتی ہے۔ اور جب یہ ہوا کہ وہ ایک ہے اور پھر سب کمال اُسی میں ہیں، تو اُس کا فیض بھی بے شک مجموعہ ساری خوبیوں کا ہو گا۔ اور جس جس کو وہ پہنچے، تھوڑا بہت اُس میں ہر قسم کا کمال ہونا چاہیئے۔" (تقریر دلپذیر)

موجودات میں تھوڑے بہت جو بھی کمال پائے جاتے ہیں، یہ سب ذاتِ خداوندی کے فیوض میں سے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کمالات کا مصدر و مبدا وہی ایک ہے۔ تو پھر اُن کے مظاہر میں یہ اختلاف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیوں ؟ مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں کہ یہ اختلافات قابلیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

".... جیسا آئینہ قلعی دار اور اینٹ پتھر میں آفتاب کا نور برابر پہنچتا ہے ۔ پر جتنا زیادہ ظہور اُس نور کا آئینے میں ہوتا ہے ۔ اُتنا پتھر میں نہیں ہوتا سو ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان کی حیات اور پتھر کی حیات یکساں ہونی چاہیئے بلکہ اتنی بات ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جو حیات کا ظہور انسان میں ہوا ہے ۔ وہ اور حیوانات میں نہیں کیونکہ انسان کے سے علوم اور کمالات کا اِن میں پتہ نہیں ۔ پھر جو بات کہ حیوانات میں پائی جاتی ہے ۔ نباتات میں نہیں پائی جاتی اور جو بات نباتات یعنی درختوں میں ظاہر میں نظر آتی ہے ، پتھر وغیرہ میں نہیں .... الغرض کسی میں حیات کا ظہور زیادہ ہے کسی میں کم ۔ کوئی بالکل مردہ نظر آتا ہے ۔ جیسے کوئی دم چُرا کر پڑ جاتا ہے ۔ پر خالی کوئی نہیں ۔ یہاں تک کہ پتھر وغیرہ کو اگر غور کیجیے تو بعضے بعضے حیات کے نشان اُن میں بھی نظر آتے ہیں ...."

مختصراً جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ، اس عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں ایک تو "وجود" ہے ۔ جسے آپ ظہورِ حیات کہہ لیجئے ۔ دوسرے اُس کی "ذات" ہے ۔ اپنی اپنی "ذات" کی وجہ سے تو ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے لیکن اِن سب میں "وجود" مشترک ہے ۔ جو ہر چیز میں جاری و ساری ہے ۔ اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہا گیا ہے ۔

انشاء اللہ آئندہ کی بحث اسی وحدت الوجود پر ہوگی ۔

"نسبتوں کو سمجھنا فلسفہ کی اصل ہے ۔ محض دلائل سے تائید اور تردید دونوں ہو سکتی ہیں ۔ نسبت کے لئے موطن کا جاننا ضروری ہے ۔ ایک چیز اصلی حالت میں ایک موطن میں ہوگی ۔ اور اُس چیز کا ظل اس موطن میں نہیں ، بلکہ دوسرے موطن میں ہوگا ۔ وجود کا ایک موطن ہے ۔ اور اس سے اوپر جو کچھ ہے وہ دوسرے موطن میں ہے ۔ وجودیہ عینیہ ایک وجود کے موطن میں ذات کو ختم کر دیتے ہیں ۔ اور ہم ذات کا موطن اس وجود سے ماوراء مانتے ہیں ۔" (مولانا سندھیؒ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افکار و آراء

ہم جنہیں اسلافِ کرام کہتے ہیں اور جن کی بزرگی کی قدر و وقعت ہمارے دلوں میں موجود ہے، وہ سب اپنے اپنے عہد میں اللہ کے نیک بندے تھے۔ اور تن من دھن سے اُسی دینِ اسلام کے پابند تھے جو حضرتِ آدمؑ سے خاتم النبیینؐ تک تمام انبیاء و رسل کا دین تھا اور جو قیامت تک اللہ کے واحد دین کی حیثیت سے قائم رہے گا۔ عالمِ انسانی میں یہ دین سب سے زیادہ قدیم ہوا۔ اور جب فطرتِ انسانی کی فلاح کے لئے یہ دین ماضی حال اور مستقبل میں موجود ہے وہ فطرت بھی اتنی ہی قدیم ہوئی۔ بعض لوگ "قدیم" کے لفظ سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ سب سے زیادہ قدیم یا قدیم ترین ہستی تو ذاتِ الوہیت کی ہے اور اسی لئے علمِ کلام میں اللہ کی اصطلاحی صفت "قدیم" ہے۔ اور اِس قدیم خلاقِ کائنات کی ہر مخلوق "حادث" کہلاتی ہے کیوں کہ وہ اپنے وجود سے پہلے غیر موجود تھی اور اللہ ہی اس کو وجود میں لایا ہے۔ انگریزی میں "کامن سینس" کا لفظ بہت عام ہے۔ اور اس حسِ عقلی کو رکھنے والا ہر انسان اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہر اچھی چیز اچھی ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پُرانی ہو۔ اور ہر بُری چیز بُری ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی نئی ہو۔ اور اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ خالقِ کائنات کے علاوہ اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ انسانی عقل تو صدیوں میں ایک چھوٹے سے کیڑے کے متعلق بھی صحیح معلومات نہیں حاصل کرسکتی۔ فلسفی جس راز کا انکشاف کرتا ہے وہ راز معہ اپنے انکشاف کے ایک اور معمّائی راز بن جاتا ہے۔ اور سائنسداں کے روزانہ بدلنے والے نظریات ہر نام نہاد "علم" کو "ظن" ثابت کرتے رہتے ہیں۔ اِن بدیہی باتوں پر مزید گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معبودِ حقیقی نے پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدمؑ کی وفات کے بعد مختلف ادوار میں متعدد انبیاءؑ کو مبعوث کیا جن میں سے بہتوں کا ذکر معہ اُن کے اہم اقوال و حالات کے آخری کتابِ الٰہی "قرآن" میں درج ہے۔ توحید، رسالت، آخرت، معروف، منکر وغیرہ کے متعلق سب انبیاءؑ ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک ہی معیار پیش کرتے ہیں اور اپنے سے سابق انبیاءؑ کا ذکر کرکے صاف صاف فرماتے ہیں کہ میں وہی بات تو کہہ رہا ہوں جو پہلے تمام انبیاء کہتے چلے آتے ہیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرتِ انسانی کبھی نہیں بدلتی۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اللہ کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین، سیارے اور فضائیں، سمندر اور پہاڑ، زمان اور مکان، یہ سب بھی آغازِ آفرینش سے اسی طرح آج تک چلے آرہے ہیں۔ کوئی چیز نہیں بدلی۔ دن اور رات کا نظام تک نہیں بدلا۔ حیوانات اور جمادات کا تسلسل بھی اُسی طرح جاری ہے۔ پرندے بھی حسبِ دستورِ سابق اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں ؎

کز ثریٰ تا بہ ثریا بہ عبودیّت اند ہمہ در ذکر و مناجات و قیام اند و قعود (سعدیؒ)

آخری رسولؐ کے مخالفین نے "فرمائش" کی کہ کوئی دوسرا قرآن لے آیئے یا اسی کو بدل دیجئے، لیکن انھیں جواب دیا گیا کہ یہ تو وحیِ الٰہی کا اتباع ہے۔ اپنے نفس کا اِلقاء نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک جسمِ انسانی کے اندر اور باہر کی تمام فضا جب ابتدائے تخلیقِ عالم سے آج تک ایک ہی ہے تو ایک نئے دین کا مطالبہ کیسا؟ انسان کی خواہشات نہ معلوم کتنی ہیں لیکن جائز خواہشات مثلاً حلال کھانا پینا پہننا اور ایک مختصر مکان بنانا وغیرہ تعداد میں محدود ہیں۔ اور بہت کم ہیں بمقابلہ اُن ناجائز خواہشات کے جن کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں اور جن کے "رنگ" بھی روز و شب افزوں ہیں پھر ہر جائز خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ، یہ طریقے تو بہت کم ہیں اور اکثر اپنی پرانی شکلوں پر قائم ہیں لیکن جائز خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقے اور پھر ہر ناجائز خواہش کی تکمیل کا طریقہ، یہ طریقے تو اتنے زیادہ ہیں کہ بے گنتی معلوم ہوتے ہیں اور برابر بدلتے بھی رہتے ہیں اور بڑھتے بھی رہتے ہیں۔ اور صرف انھیں "طریقوں" (جن کا معصیت ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں) کی "بوقلمونی" کے باعث کسی "عصرِ حاضر" کے "دانشمندوں" کا یہ نعرہ کس قدر "غیر دانشمندانہ" ہے۔ کہ "دنیا بدل گئی ہے، زمانہ بدل گیا ہے، وہ دین اب نہیں چل سکتا....."

نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ بدلتا ہے، نہ انسانی فطرت بدلتی ہے، نہ جائز خواہشات بدلتی ہیں، نہ

© rasailojaraid.com